© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محرم الحرام ۱۳۹۵ھ (فروری ۱۹۷۵ء) کے ترجمان القرآن میں جناب جسٹس فدیا الدین کے مقالے "قرآن کا تصورِ ریاست" پر چند معروضات پیش کی گئی تھیں اور ان کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا جسے ان صفحات میں مکمل کیا جا رہا ہے۔

جسٹس صاحب کے پورے مقالے کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن مجید اسلامی ریاست کے قیام کا قطعاً داعی نہیں۔ اجتماعی معاملات میں اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ اس کرہ ارض کو پختہ سیرت و کردار رکھنے والے افراد سے معمور کر دے۔ جسٹس صاحب نے جو بات ارشاد فرمائی ہے اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن انسان کو سیرت کے اعتبار سے بلند مقام پر فائز دیکھنا چاہتا ہے لیکن فاضل مقالہ نگار کے موقف اور طرز استدلال کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے تحت الشعور میں دین اور سیاست کی دوئی کا وہی تصور کار فرما ہے جو اہل یورپ کے دماغ پر مستولی ہے۔ اصل سوال سیرت و کردار کی پختگی کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کیا کسی ادارے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص نظریۂ حیات کی اس دنیا میں عملداری قائم کرے۔ مجرد سیرت و کردار کی پختگی کی باتیں تو شاعرانہ باتیں ہیں۔ انسان جس طرزِ عمل کو سیرت و کردار سے تعبیر کرتا ہے اس کے اندر اس وقت تک قطعاً کوئی معنویت پیدا نہیں ہوتی جب تک وہ نصب العین سامنے نہ ہو جس کے حصول کے لیے کسی قوم کی سیرت پختہ بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ جس طرح کسی کتاب کی قدر و قیمت کا تعین اس مقصد سے کیا جاتا ہے جو کسی طالب علم کے پیشِ نظر ہوتا ہے بالکل اسی طرح سیرت و کردار کا تعین بھی اُن مقاصد کی روشنی میں ہوتا ہے جو کوئی قوم حاصل کرنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ فلسفے کے ایک طالب علم کے لیے جس طرح طبیعیات کی ایک کتاب دفترِ بے معنی کی حیثیت رکھتی ہے بالکل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی انداز سے سیرت و کردار کی رفعت کا مغربی تصور مسلم قوم کے لیے کسی اہمیت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اہلِ مغرب نے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے علمی سطح پر جو سازشیں کی ہیں اُن میں ایک نہایت ہی خطرناک سازش یہ ہے کہ اسلامی اصطلاحات اور دینی تصورات میں بظاہر اتنی وسعت پیدا کر دی جائے جس سے اسلام کی ہمہ گیری میں اضافہ ہو اور جن میں انسان کھو کر دینِ حق سے لاشعوری طور پر دُور ہوتا چلا جائے۔ یوں تو اس سلسلے میں سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں ہم چند ایک کے ذریعے اس سازش کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ جملے اکثر سُننے میں آتے ہیں کہ "اسلام آفاقی اقدار حیات کا علمبردار ہے"۔ "یہ چند ابدی صداقتوں اور ناقابلِ انکار حقیقتوں کا نام ہے"۔ "یہ فطرت کا ترجمان ہے"۔ اسلام کے بارے میں یہ جملے بادی النظر میں کتنے حسین و دلکش معلوم ہوتے ہیں اور ان سے اسلام کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا نقش کس خوبی سے ذہن پر مرتسم ہوتا ہے لیکن دَورِ جدید میں ان جملوں کی مدد ہی سے ذہنوں میں الحاد کا زہر پھیلایا جا رہا ہے۔ اسلام کی آفاقی اقدار اور عالمگیر صداقتوں کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جس طرح قوانینِ طبیعی میں صحیح اور غلط، محمود و مذموم، حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسلام کے وہی ضابطے صحیح اور برحق ہیں جو اس قسم کے مصنوعی امتیازات سے یکسر پاک ہوں اور جن میں قوانینِ طبیعی کی سی معروضیت پائی جائے۔ اس تصوّر کو اگر کسی معاشرے میں سرایت کرنے کا موقع مل جائے تو کیا وہ معاشرہ کسی ایسے نظامِ شرعی کو قبول کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے جو خوب و ناخوب، جائز و ناجائز اور حق و باطل کے مابین واضح امتیازات سے عبارت ہو۔ اسلام واقعی آفاقی اقدار کا علمبردار ہے لیکن اس کی آفاقی اقدار کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان میں قوانینِ طبیعی کی سی بے لوثی پائی جاتی ہے اور اس بنا پر ان کے درمیان حق و باطل کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔ اسلام کی آفاقی اقدار سے مراد یہ ہے کہ جس خالق نے قوانینِ طبیعی وضع کیے ہیں اسی حاکمِ مطلق نے قوانینِ شرعی کی تشکیل کی ہے اور یہ قوانین بھی اسی طرح ہمہ گیر اور ازلی و ابدی ہیں جس طرح کہ قوانینِ طبیعی اور ان کا اطلاق تمام انسانوں اور تمام ادوار پر یکساں ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کہ قوانینِ طبیعی اور قوانینِ شرعی کے مابین جو بنیادی اور نمایاں فرق ہے اُسے بے خبری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا یہ حرکت جان بوجھ کر کی جاتی ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شریعت کے تقاضے اور مطالبات نظروں سے یکسر اوجھل ہو جاتے ہیں۔ آپ جب قوانینِ شرعی کو قوانین طبیعی پر قیاس کریں گے تو آپ کے ذہن سے لامحالہ حق کے ساتھ وابستگی کا غیر معمولی احساس اور باطل سے شدید نفرت کا جذبہ ختم ہو جائے گا کیونکہ قوانین طبیعی کے معاملے میں اس طرح کے مثبت اور منفی احساسات بالکل عنقا ہوتے ہیں۔ پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ قوانین شرعی کو قوانین طبیعی سمجھ لینے سے وہ امنگ بھی باقی نہیں رہتی جو ایک حق پرست انسان اپنے دل میں الہامی ضابطوں کے بارے میں پالتا ہے۔ قوانین طبیعی کے متعلق انسان کا فطری احساس یہی ہوتا ہے کہ جو قانون جس صورت میں موجود ہے وہی صحیح ہے نہ تو اس کی ہمہ گیری اور وسعت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی عملداری میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں اُن کا خاموش تماشائی کی حیثیت سے مشاہدہ کر کے ان کے اثرات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ ان کے نفاذ کے بارے میں انسان پر قطعاً کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس طرزِ استدلال کو جب ہم آگے بڑھاتے ہیں تو یہ نتیجہ خود بخود اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح انسان قوانین طبیعی کے نفاذ کے سلسلے میں بری الذمہ ہیں بالکل اسی طرح تمام انسانی ادارے قوانین شرعی کے تسلط کے معاملے میں اپنی کوئی ذمہ داری نہیں رکھتے۔ انسان کو جو کچھ درکار ہے وہ صرف یہ کہ انسانی سیرت کو مضبوط بنانے پر زور صرف کیا جائے کیونکہ جب سیرت پختہ ہو جائے گی تو خدا کی بادشاہت دنیا میں خود بخود قائم ہو جائے گی۔ لہذا اسلامی ریاست جو ایک انسانی ادارہ ہے، کا قیام اسلامی نقطۂ نظر سے کسی مسلمان کا مطلوب و مقصود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس ضمن میں جسٹس صاحب کی تصریحات ملاحظہ ہوں:

"قرآن مجید کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا کو مضبوط سیرت و کردار رکھنے والے افراد سے آباد کیا جائے جو بیک وقت نیک اور خدا ترس ہوں (قرآن) کے پیش نظر زمین پر آسمانی بادشاہت قائم کرنا ہے، سلطنتیں تعمیر کرنا نہیں۔"

اس فقرے کے بعد فاضل مقالہ نگار بڑے حقارت آمیز لہجے میں اسلامی ریاست کی یوں تعریف بیان کرتے ہیں:

"(اسلامی) ریاست بجز اس کے اور کیا ہے کہ وہ لوگ جو اطاعتِ خداوندی میں وقت کے تعین کے بغیر، زندہ رہنے اور جان دینے کے متمنی ہیں وہ اقتدار اور دولت کے حصول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی خواہش کرنے لگیں۔" مذ

ان چند جملوں میں جسٹس صاحب نے اپنے خیالات کی روح کشید کر رکھ دی ہے اور اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ اس پر کوئی حرف گیری نہ کی جاسکے۔ ان جملوں پر اگر غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک غلط بات کو فلسفیانہ رنگ دے کر صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے لیکن مغلق عبارت اور اُلجھے ہوئے طرز استدلال سے حقیقت کو تو نہیں جھٹلایا جاسکتا۔ آپ ذرا ان کی منطق ملاحظہ فرمائیں، ہیرلڈ لاسکی کے ایک قول کا سہارا لے کر وہ یہ فرماتے ہیں کہ ریاست کا نظریہ زمانے کے سیاق و سباق ہی میں صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے لیکن چونکہ قرآن کی اصطلاحات زمانے سے ماورا ہونے کی بنا پر ازلی و ابدی ہیں اس بنا پر اسلامی ریاست کا تصور قرآن مجید کی آفاقیت کی نفی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اگر قرآنی تعلیمات آفاقی اور ازلی تسلیم کرلی جائیں تو پھر اسلامی ریاست کا وجود غلط ہے اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ اسلام ریاست کا ایک مخصوص نقشہ بھی پیش کرتا ہے تو پھر ہم پر اسلامی تعلیمات کے آفاقی مزاج کا انکار لازم آتا ہے۔ اب اگر ہمیں اسلام کی آفاقیت کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں لامحالہ اسلامی ریاست کے قیام کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

فاضل مقالہ نگار اور اس انداز پر سوچنے والے دوسرے اصحابِ علم کے نزدیک اسلام کی آفاقیت کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسلام کے وہ سارے ادارے جن پر زمان و مکان کی چھاپ لگنے کا کوئی احتمال ہوسکتا ہے انہیں دین سے خارج کر دیا جائے مثلاً آپ اسلامی ریاست کو ہی لیجیے۔ ان حضرات کے استدلال کے مطابق حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفا نے مملکت کا جو ڈھانچہ قائم کیا تھا وہ چونکہ ایک خاص دور اور اس دَور کے مخصوص تقاضوں کے تحت معرض وجود میں آیا تھا اس لیے " اصل اسلام " سے جو آفاقی اقدار کا حامل ہے، اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک انسانی ادارہ تھا جو اس دور کے انسانوں کے ساتھ دفن ہوگیا۔ اسی استدلال کے مطابق اسلام کے تمام دوسرے ادارے جن کا تعلق حیاتِ انسانی کے اجتماعی معاملات سے ہے، کالعدم قرار پاتے ہیں۔

ممکن ہے بعض حضرات کے لیے یہ انکشاف ہو لیکن جو لوگ اسلام کے خلاف برپا ہونے والے مختلف فتنوں کی نوعیت کو جانتے ہیں انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ فتنہ انکارِ حدیث بھی اسلام کی " آفاقی " حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو قائم رکھنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے جس حصے کو ہم سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعبیر کرتے ہیں وہ آخر اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منشا خداوندی کو جس انداز اور جس شکل و صورت کے ساتھ پیکر محسوس میں ڈھال کر اس کے عملی مقتضیات کی وضاحت فرمائی وہ بھی دین کا ایک لازمی حصہ ہی ہے۔ اس حقیقت کو آپ یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دین کی آفاقی اقدار کو عملی زندگی کا پیرہن عطا کرنے کا جو کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سر انجام پایا وہی سنت رسولؐ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آفاقی تعلیمات کے عملی مضمرات واضح کرنے کے لیے کئی ایک انسانی ادارے قائم کیے اور جو پہلے سے موجود تھے ان کی تطہیر کر کے انہیں منشا خداوندی کے مطابق از سر نو مرتب کیا۔ ان اداروں کی شکل و صورت میں بلاشبہ زمان و مکان کا عکس بھی موجود تھا لیکن اس عکس سے اسلام کی آفاقی رُوح کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتی کیونکہ یہ ادارے اسلام کے آفاقی مزاج کی عملی توجیہہ کے لیے ہی قائم کیے گئے تھے۔

منکرین حدیث سنت کی ابدی حیثیت کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے رسول کی حیثیت سے جو پیغام دیا وہ قرآن کی صورت میں ایک آفاقی دعوت کے طور پر موجود ہے لیکن اس دعوت کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو ادارے جس انداز اور جس صورت میں قائم کیے گئے اُن پر چونکہ وقت کی چھاپ تھی اس لیے وہ اسلام کے سرمدی پیغام کے ترجمان نہیں ہو سکتے۔ منکرین حدیث کے مقابلے میں اہل سنّت کا مسلک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے ابدی پیغام کی عملی توضیح و تشریح کے لیے معیشت، معاشرت، ریاست اور عبادت کا جو مخصوص نظام اور ڈھانچہ تیار کیا وہ اسلام کے سرمدی پیغام کا اسی طرح ایک حصہ ہے جس طرح کہ قرآن مجید کی تعلیمات لہٰذا وہ سارے انسانی ادارے جن کی تشکیل و ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں ہوئی وہ بھی دین کی مقدس تعلیمات کی طرح مقدس ہیں اور اسلام اس باب میں مسلمانوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ جہاں وہ دینِ حق کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نظامِ عبادت قائم کریں وہاں وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے نظام معاشرت، نظام معیشت اور نظام مملکت کو اسی نہج پر ترتیب دیں جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر جاں نثاروں نے حیات اجتماعی کو ترتیب دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس طرح خداوند تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے فرائض ادا کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی بالکل اسی طرح انسان خدا کا قرب اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اُن اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش نہ کرے جنہیں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مقدس میں پورا کرنے کے لیے بھرپور جد و جہد کی تھی اگر حج ایک دینی فریضہ ہے تو بدر و حنین کی معرکہ آرائی بھی ایک دینی تقاضا ہی ہے، اگر نماز کے ادا کرنے سے خدا کا قرب نصیب ہوتا ہے تو اسلام کے نظامِ عدل کا قیام بھی اسی کی رضا جوئی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اگر معروف کی پابندی اور منکرات سے اجتناب مالک الملک کی خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے تو جو نظامِ معروف کی عملداری قائم کرنے اور منکرات کے استیصال کے لیے قائم کیا جاتا ہے اُسے بھی خالقِ کائنات بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو لوگ اس کے قیام کے لیے سعی و جہد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی خوشنودی کے پروانے عطا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ	(مسلمان) وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ	اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے۔
وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا	زکوٰۃ دیں گے۔ اور بدی سے روکیں گے۔
عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ	(الحج ۴۱)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر بہ حیثیت جماعت یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ تمکن فی الارض حاصل ہو جانے کی صورت میں وہ ایک ایسا صالح نظام قائم کریں جس میں نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے ساتھ نیکی کو فروغ حاصل ہو اور بُرائی کی بیخ کنی ہو جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ فرائض کوئی بااختیار انسانی ادارہ ہی سر انجام دے سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ فرائض عاید کیے ہیں تو لامحالہ انہیں اس بات کا بھی مکلف ٹھیرایا ہے کہ وہ ایسا ادارہ قائم کریں جس کی مدد سے وہ ان اجتماعی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے مقاصد نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیے ہیں تو پھر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس ذاتِ برحق نے ریاست کے وجود کو غیر ضروری قرار دیا ہوگا۔ قرآن مجید میں بڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھلے انداز میں اسلامی ریاست کے مقاصد کی یوں نشاندہی کی گئی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج	اُتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

(الحدید ۲۵)

معاشرے میں اجتماعی عدل کے قیام کی ذمہ داری وہ نازک اور مقدس ذمہ داری ہے جو اُمت مسلمہ کے کندھوں پر انبیاء کے جانشین کی حیثیت سے ڈالی گئی ہے۔ اگر اجتماعی عدل کا قیام ایک مقدس دینی فریضہ ہے تو جس ذریعے سے یہ ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو سکتا ہے وہ ذریعہ بھی اتنا ہی مقدس ہے جتنا کہ خود یہ مقصد۔ یہ ایک معقول اور سیدھی سادھی بات ہے مگر جسٹس صاحب کو اس سے شدید اختلاف ہے ان کے نزدیک یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اسلامی قوانین کو ریاست کی قوتِ نافذہ کے ذریعے کسی معاشرے میں نافذ کیا جائے۔ جسٹس صاحب کا استدلال ملاحظہ ہو:

"اگر مسلمانوں کو تمکن فی الارض حاصل ہو جائے تو نہی عن المنکر کا یہ مقصد ہوگا کہ غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے اور مومنین کو بہتر مسلمان بنانے کے لیے قوت کا استعمال کریں۔ میرے نزدیک اس تمکن کی یہ غرض کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کا یہ مطلب لینا روحِ قرآنی کے منافی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے پاکیزہ زندگی کی مثال پیش کر کے ان کا اعتماد حاصل کیا جائے اور پھر انہیں ترغیب کے ذریعے (راہ راست) پر لایا جائے۔"

ان ارشادات کے بعد جسٹس صاحب اپنا سارا زورِ بیان اس امر کی وضاحت میں صرف کرتے ہیں کہ اسلام جیسا دینِ فطرت جو رواداری کا زبردست داعی ہے وہ قوانین شرعی کے نفاذ میں قوت کے استعمال کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے آیت لا اکراہ فی الدین کے سیاق و سباق پر غور کیے بغیر جس طرح غلط استدلال کیا ہے اسے کسی اعتبار سے بھی علمی طرزِ استدلال نہیں کہا جا سکتا۔

معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ بات کہاں سے اخذ کر لی ہے کہ دورِ جدید کے مسلمان ... شرعی (باقی بر صفحہ ۴۷)

© rasailojaraid.com